منگرو کو سمجھایا کہ اگر اس وقت ہوری پر دعویٰ کر دیا جائے تو سب روپئے
ل ہو جائیں۔ منگرو اتنا رحیم نہیں جتنا کامل تھا، جھنجھٹ میں نہ پڑنا چاہتا
۔ مگر جب پٹیشوری نے ذمہ لیا کہ اسے ایک دن بھی کچہری نہ جانا پڑے گا۔
ئی اور تکلیف ہوگی، بیٹھے بٹھائے اس کی ڈگری ہو جائے گی، تو وہ نالش
نے پر راضی ہوگیا اور عدالتی صرفے کے لئے روپئے بھی دے دئے۔
ری کو پتہ بھی نہ تھا کہ یہاں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ کب دعویٰ دائر ہوا
رب ڈگری ہوئی، اسے بالکل معلوم نہ ہوا جب قرق امین اس کی ایکھ
م کرنے آیا تب اسے خبر ہوئی۔ سارا گانوں کھیت کے کنارے جمع ہوگیا
ری منگرو ساہ کے پاس دوڑا اور دھنیا پٹیشوری کو گالیاں دینے لگی۔ وہ سمجھ
کہ یہ سب کام پٹیشوری ہی کا ہے۔ مگر منگرو ساہ پوجا پر تھے، ہل نہ سکے اور
ھنیا گالیوں کی برکھا کر کے بھی پٹیشوری کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ ادھر ایکھ ڈیڑھ سو
روپئے میں نیلام ہوگئی اور بولی بھی منگرو ہی کے نام پر ختم ہوگئی۔ کوئی دوسرا
آدمی نہ بول سکا۔ دانا دین میں بھی دھنیا کی گالیاں سننے کی ہمت نہ تھی۔

دھنیا نے ہوری کو اکسا کر کہا: "بیٹھے کیا ہو، جا کر پٹواری سے پوچھتے
کیوں نہیں کہ یہی دھرم ہے تمہارا گانوں گھر کے لوگوں کے ساتھ؟"

ہوری نے عاجزانہ کہا: "پوچھنے کے لئے تم نے منہ بھی رکھا ہو تیری
گالیاں کیا انھوں نے نہ سنی ہوں گی؟"

"جو گالی کھانے کا کام کرے گا اسے گالی ملے گی ہی۔"

"تو گالیاں بھی دے گی اور بھائی چارہ بھی بنا ہے گی؟"

"دیکھوں گی کہ میرے کھیت کے پاس کون آتا ہے؟"

"ل والے آکر کاٹ کے جائیں گے۔ تو کیا کرے گی اور میں کیا کروں

گالیاں دے کر اپنی جیبھ کی کھجلی چاہے مٹالے۔"

"میرے جیتے میرا کھیت کوئی کاٹ لے جائے گا۔"

"ہاں ہاں، تیرے اور میرے جیتے؛ سارا گاؤں مل کر بھی اسے نہیں سکتا۔ اب وہ بیج (چیز) میری نہیں، منگرو ساہ کی ہے۔"

منگرو ساہ نے مر کر جیٹھ کی دوپہری میں سچائی اور گڑائی کی تھی؟"

وہ سب تو نے کیا، مگر اب وہ بیج منگرو ساہ کی ہے ہم ان کے کرجدا (قرض دار) نہیں ہیں؟"

اکھ تو گئی مگر اس کے ساتھ ہی ایک نیا مسئلہ آپڑا۔ دلاری اسی اکھ پر روپئے دینے کو تیار ہوئی تھی۔ اب وہ کس ضمانت پر روپئے دے۔ ابھی اس کے پہلے ہی کے دو سو روپئے پڑے ہوئے تھے۔ سوچا تھا کہ اکھ کے پرانے روپئے مل جائیں گے تو نیا حساب چلنے لگے گا۔ اس کی نظر میں ہوری کی ساکھ دو سو تک کی تھی۔ اس سے زیادہ دینا جوکھم تھا۔ سہالگ سر پر تھا تاریخ طے ہو چکی تھی۔ گوری مہونے ساری تیاریاں کر لی ہوں گی۔ اب بیاہ کا ٹلنا ناممکن تھا۔ ہوری کو ایسا غصہ آتا تھا کہ جا کر دلاری کا گلا گھونٹ دے جتنی منت سماجت ہو سکتی تھی وہ کر چکا، مگر وہ پتھر کی دیوی ذرا بھی نہ پسیجی۔ اس نے چلتے چلتے ہاتھ جوڑ کر کہا "دلاری میں تمھارے روپئے لے کر بھاگ نہ جاؤں گا، نہ اتنی جلد مرا ہی جاتا ہوں۔ کھیت ہیں، پیڑ ہیں، گھر ہے، جوان لڑکا ہے، تمھارے روپئے مارے نہ جائیں گے۔ میری مرجاد جا رہی ہے اسے سنبھالو۔" مگر دلاری نے کاروبار میں رحم کی شمولیت منظور نہ کی۔ اگر کاروبار کو وہ رحم کی صورت دے سکتی تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا، مگر رحم کو کاروباری صورت دینا اس نے نہ سیکھا تھا۔

ہوری نے گھر آکر دھنیا سے کہا: "اب؟"

دھنیا نے اسی پر دل کا غبار نکالا: "یہی تو چاہتے تھے۔"

ہوری نے زخمی آنکھوں سے دیکھا: "میرا ہی دوکھ ہے؟"

"کسی کا بھی دوکھ ہو پر ہوئی تو تمھارے من کی۔"

"تیری اچھا ہے کہ جمین (زمین) رہن رکھ دوں؟"

"جمین رہن رکھ دو گے تو کرو گے کیا؟"

"مجوری" (مزدوری)

مگر زمین دونوں کو یکساں عزیز تھی۔ اسی پر تو ان کی عزت اور آبرو قائم تھی جس کے پاس زمین نہیں وہ گرست نہیں، مزدور ہے۔

ہوری نے کچھ جواب نہ پاکر پوچھا: "تو کیا کہتی ہے؟"

دھنیا نے زخمی گلے سے کہا: "کہنا کیا ہے۔ گوری برات لے کر آئیں گے تو ایک جون کھلا کر سیرے لڑکی بدا کر دینا۔ دنیا ہنسے گی تو ہنس لے۔ بھگوان کی یہی اچھا ہے کہ ہماری ناک کٹے اور ہمارے منہ میں کالکھ لگے تو ہم کیا کریں گے؟"

دفعتاً نہری چوندری پہنے سامنے سے جاتی ہوئی نظر پڑی۔ ہوری کو دیکھتے ہی اس نے ذرا سا گھونٹ نکال لیا۔ اس سے سمدھی کا ناتا مانتی تھی۔

دھنیا سے اس کی شناسائی ہو چکی تھی۔ اس نے پکارا: "آج کدھر چلیں سمدھن؟ آؤ بیٹھو۔"

نہری نے فتح پائی تھی اور اب رائے عامہ کو اپنی موافقت میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آکر کھڑی ہو گئی۔

دھنیا نے اسے سر سے پیر تک نقادانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا: "آج ادھر کیسے بھول پڑیں؟"

نہری نے انکسار سے کہا: "ایسے ہی تم لوگوں سے ملنے چلی آئی۔ لڑکی کا بیاہ کب تک ہے؟"

دھنیا شبہ سے بولی: "بھگوان مالک ہیں، جب ہو جائے گا۔"

"میں نے تو سنا کہ اسی لگن میں ہوگا۔ ساعت ٹھیک ہو گئی ہے؟"

"ہاں، ساعت تو ٹھیک ہو گئی ہے۔"

"مجھے بھی نیوتا دینا۔"

"تمھاری تو لڑکی ہے، نیوتا کیسا؟"

"دہیج کا سامان تو منگوا لیا ہوگا۔ جرا ذرا میں بھی دیکھوں۔"

دھنیا شش و پنج میں پڑی، کیا کہے؟ ہوری نے اسے سنبھالا۔

"ابھی تو کوئی سامان نہیں منگایا ہے، اور سامان کیا کرنا ہے، کسا کنیا تو دینا ہے۔"

نہری نے بے اعتباری سے دیکھا: "کسا کنیا کیوں دوگے مہتو؟ پہلی لڑکی ہے، دل کھول کر کرو۔"

ہوری ہنسا، گویا کہہ رہا تھا کہ تمھیں تو چاروں طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہوگا مگر یہاں تو سوکھا ہی پڑا ہوا ہے: "روپے پیسے کی تنگی ہے، کیا دل کھول کر کروں؟ تم سے کون پردہ ہے۔"

"لڑکا کماتا ہے، تم کماتے ہو، پھر بھی روپے پیسے کی تنگی ہے؟ کسے لبواس آئے گا؟"

بیٹا ہی لایک (لائق) ہوتا تو پھر کاہے کا رونا تھا؟ چھٹی پتری تک

بھیجتا نہیں، تو روپئے کیا بھیجے گا؟ یہ دوسرا سال ہے، ایک بھی چٹھی نہیں آئی۔"

اتنے میں سونا بیلوں کے واسطے سبز چارے کا ایک گٹھا سر پر لئے ہوئے اور شباب کو آنچل سے چھپاتی ہوئی، معصومانہ رفتار سے آئی اور گٹھا وہیں پٹک کر اندر چلی گئی۔

نہری نے کہا: "لڑکی تو سیانی ہوگئی ہے۔"

دھنیا بولی: "لڑکی کی باڑھ تو رینڈ (ارنڈ) کی باڑھ ہے، نہیں، ہے ابھی کئے دن کی۔"

"بر تو ٹھیک ہوگیا ہے نا؟"

"ہاں بر تو ٹھیک ہے روپئے کا بندوبست ہوگیا تو اسی مہینے میں بیاہ کر دیں گے۔"

نہری اچھی طبیعت کی تھی۔ ادھر اس نے جو تھوڑے سے روپئے جمع کئے تھے وہ اس کے پیٹ میں اچھل رہے تھے۔ اگر وہ سونا کے بیاہ میں کچھ روپئے دے دے تو کتنا نام ہوگا۔ سارے گانوں میں اس کا چرچا ہوجائے گا۔ لوگ تعجب سے کہیں گے کہ نہری نے اتنے روپئے دے دیئے۔ بڑی دیوی ہے۔ نہری اور دھنیا دونوں گھر گھر اس کا بکھان کرتے پھریں گے۔ گانوں میں اس کی مرجاد کتنی بڑھ جائے گی۔ وہ انگلی دکھانے والوں کا منہ سی دے گی۔ پھر کس کی ہمت ہے جو اس پر ہنسے یا بولیاں بولے؟ ابھی گانوں بھر اس کا بیری ہے، پھر گانوں بھر اس کا ہتوا خیرخواہ ہوجائے گا۔ اس خیال سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ بولی: "تھوڑے بہت سے کام چلتا ہو تو مجھ سے لے لو، جب ہاتھ میں روپئے آجائیں تو

تو دے دینا۔"

ہوری اور دھنیا نے اس کی طرف دیکھا نہیں، نہری مذاق نہیں کر رہی ہے۔ دونوں کی آنکھوں میں حیرت تھی، ممنونیت تھی، شک تھا اور شرم تھی۔ نہری اتنی بڑی نہیں ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔

نہری نے پھر کہا: "تمھاری اور ہماری آبرو ایک ہے۔ تمھاری ہنسی ہو تو کیا میری ہنسی نہ ہوگی؟ کیسے ہی بھی ہوا ہو، پر اب تو تم ہمارے سمدھی ہو۔"

ہوری نے شرماتے ہوئے کہا: "تمھارے روپئے تو گھر ہی میں، جب کام پڑے گا لے لیں گے۔ آدمی اپنوں ہی کا تو بھروسہ کرتا ہے۔ مگر اوپر سے بندوبست ہو جائے تو گھر کے روپئے کیوں چھوئیں؟"

دھنیا نے تائید کی: "ہاں اور کیا۔"

نہری نے اپنا واجبایا: "جب گھر میں روپئے ہیں تو باہر والوں کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلاؤ؟ بیاج بھی دینا پڑے گا: اس پر اسٹام لکھو گواہی کراؤ، دستوری دو اور کھوسامد (خوشامد) کرو۔ ہاں میرے روپئے میں چھوت لگی ہو تو دوسری بات ہے۔"

ہوری نے سنبھالا: "نہیں نہیں، جب گھر میں کام چل جائے گا تو باہر کیوں ہاتھ پھیلائیں گے؟ پر آپس والی بات ہے، کھیتی باری کا بھروسہ نہیں، کہیں جلدی کوئی کام پڑا اور ہم روپئے نہ دے سکے تو تمھیں بھی برا لگے گا اور ہماری جان بھی سنکٹ میں پڑے گی۔ اسی سے کہتا تھا۔ نہیں، لڑکی تو تمھاری ہے۔"

"مجھے ابھی روپئے کی ایسی جلدی نہیں ہے۔"

"تو تم ہی سے لے لیں گے۔ کنیا دان کا پھل بھی کیوں باہر جائے؟"

"کتنے روپئے چاہئے؟"

"تم کتنے دے سکو گی؟"

"سو میں کام چل جائے گا؟"

ہوری کو لالچ آیا بھگوان نے چھپر پھاڑ کر روپئے دئے ہیں تو جتنا لے سکے کیوں نہ لے۔

"سو میں بھی چل جائے گا، پانسو میں بھی چل جائے گا۔ جیسا حوصلہ ہو۔"

"میرے پاس کل دو سو روپئے ہیں، سو میں دے دوں گی۔"

"تو اتنے میں بہت اچھی طرح کام چل جائے گا۔ اناج گھر میں ہے مگر ٹھکرائن، آج تم سے کہتا ہوں کہ میں تمھیں ایسی کبھی نہ سمجھتا تھا۔ آج کل کون کس کی مدد کرتا ہے اور کس کی پاس ہے؟ تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔"

چراغ جلنے کا وقت آگیا تھا۔ ٹھنڈک پڑنے لگی تھی۔ زمین نے نیلی چادر اوڑھ لی تھی۔ دھنیا اندر جا کر انگیٹھی لائی اور سب تاپنے لگے۔ پوال کی روشنی میں چھبیلی رنگیلی، بدچلن نہری ان کے سامنے بردان کی طرح بیٹھی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کتنی ہمدردی ہے۔ گالوں پر کتنی حیا اور حیا اور ہونٹوں پر کتنی راست کلامی! کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے نہری اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی گھر چلی "اب دیر ہو رہی ہے۔ کل تم آ کر روپئے لے لینا مہتو۔"

"چلو میں تمھیں پہنچا دوں۔"

"نہیں نہیں، تم بیٹھو، میں چلی جاؤں گی۔"

"جی تو چاہتا ہے کہ تمھیں کندھے پر بٹھا کر پہنچا آؤں۔"

نوکھے رام کی چوپال گاؤں کے دوسرے سرے پر تھی اور باہر باہر جانے کا راستہ صاف تھا۔ دونوں اسی راستے سے چلے اب چاروں طرف سناٹا تھا۔

نہری نے کہا: "تنک سمجھا نہیں دیتے رات کو، کیوں سب سے لڑائی کیا کرتے ہیں، جب ان ہی لوگوں کے بیچ میں رہنا ہے تو ایسے رہنا چاہیئے نا، کہ چار آدمی اپنے ہو جائیں اور ان کا حال یہ ہے کہ سب سے لڑائی، سب سے جھگڑا، جب تم مجھے پردے میں نہیں رکھ سکتے اور مجھے دوسروں کی مجوری کرنی پڑتی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نہ کسی سے ہنسوں نہ بولوں اور نہ کوئی میری طرف (طرف) تاکے نہ ہنسے؟ یہ سب تو پردے ہی میں ہو سکتا ہے۔ پوچھو، کوئی مجھے تاکتا ہے یا گھورتا ہے تو میں کیا کروں؟ اس کی آنکھیں تو نہیں پھوڑ سکتی۔ پھر میل محبت سے آدمی کے سو کام نکلتے ہیں۔ جیسا بکھت (وقت) دیکھو ویسا بیوہار کرو۔ تمھارے گھر ہاتھی جھومتا تھا تو اب وہ تمہارے کس کام کا؟ اب تو تم تین روپئے کے مجور ہو۔ میرے گھر سو بھینسیں لگتی تھیں پر اب تو مجور ہوں۔ مگر ان کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں۔ کبھی لڑکوں کے ساتھ رہنے کی سوچتے ہیں اور کبھی لکھنؤ جا کر رہنے کی سوچتے ہیں۔ میری ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

ہوری نے چاپلوسی کی: "یہ بھولا کی سراسر نادانی ہے۔ بوڑھے ہوئے، اب تو انھیں سمجھ آنی چاہیئے۔ میں سمجھا دوں گا۔"

"تو سویرے آجانا، میں روپئے دے دوں گی۔"
"کچھ لکھا پڑھی....."
"تم میرے روپئے کھا نہ جاؤ گے، یہ میں جانتی ہوں۔"
اس کا گھر آگیا تھا وہ اندر چلی گئی۔ ہوری گھر لوٹا۔

گوبر کو شہر آنے پر معلوم ہوا کہ جس جگہ وہ اپنا خوانچہ لے کر بیٹھتا تھا وہاں ایک دوسرا خوانچہ والا بیٹھنے لگا ہے اور گاہک اب گوبر کو بھول گئے ہیں وہ گھر بھی اب اسے پنجرا سا لگتا تھا۔ جھنیا اب اس میں تنہا بیٹھی ہوئی رویا کرتی لڑکا دن بھر آنگن میں یا دروازے کا عادی تھا۔ وہاں اس کے کھیلنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ کہاں جائے؟ دروازے پر مشکل سے گز بھر کا راستہ تھا جہاں عفونت پھیل رہی تھی۔ گرمی میں کہیں باہر لیٹنے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ لڑکا ماں کو ایک لمحے کے لئے چھوڑتا نہ تھا اور جب کچھ کھیلنے کو نہ ہو تو کچھ کھانے اور دودھ پینے کے علاوہ اور کیا کرے؟ گھر پر کبھی دھنیا کھلاتی، کبھی روپا، کبھی ہورکی، کبھی پنیا۔ یہاں تنہا جھنیا تھی اور اسے گھر کا سارا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔

اور گوبر شراب کے نشے میں بدمست تھا۔ اس کی آسودہ نہ ہونے والی خواہشیں نفس پرستیوں کے سمندر میں غرق ہو جانا چاہتی تھیں۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ خوانچہ لے کر جاتا تو گھنٹے ہی بھر میں لوٹ آتا۔ دلچسپی کا کوئی دوسرا سامان نہ تھا۔ پڑوس کے مزدور ادریکے والے رات رات بھر تاش اور جوا کھیلتے تھے۔ پہلے وہ بھی خوب کھیلتا تھا، مگر اب اس کے لئے صرف ایک ہی دلچسپ مشغلہ تھا اور وہ تھا جھنیا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا۔ تھوڑے ہی دنوں میں جھنیا اس زندگی سے اکتا گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ کہیں تخلیہ میں جا کر بیٹھے اور خوب بے فکری سے لیٹے، سوئے، مگر وہ تخلیہ

کہیں نہ ملتا تھا۔ اسے اب گوبر پر غصہ آرہا تھا۔ اس نے شہری زندگی کی کتنی دلکش تصویر کھینچی تھی اور یہاں اس کال کوٹھری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بچے پر بھی اسے چڑھ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کو مار کر باہر نکال دیتی اور اندر سے کواڑ بند کر لیتی۔ بچہ روتے روتے بیدم ہو جاتا۔

اس پر مصیبت یہ کہ اس کے دوسرا بچہ ہونے والا تھا، اور کوئی آگے نہ پیچھے اکثر سر میں درد ہوا کرتا۔ کھانے سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ ایسی سستی تھی کہ گوشے میں خاموش پڑی رہے اور کوئی اس سے نہ بولے چالے۔ مگر یہاں گوبر کی بیدردانہ محبت اپنے خیر مقدم کے لئے ہمیشہ دروازہ کھٹکھٹاتی رہی تھی اگرچہ دودھ نام کو بھی نہیں تھا پھر بھی للو سینے پر سوار رہتا۔ جسم کے ساتھ اس کا دل بھی کمزور ہو گیا تھا۔ وہ جو ارادہ کرتی اسے ذرا سے اصرار پر فسخ کر دیتی وہ لیٹی ہوتی اور للو آکر جبراً اس کے سینے پر بیٹھ جاتا اور دودھ پینے کی کوشش کرتا۔ وہ اب دو سال کا ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے تیز دانت نکل آئے تھے۔ منہ میں دودھ نہ جاتا تو وہ غصے میں آکر دانتوں سے کاٹ لیتا۔ مگر جھنیا میں اب اتنی سکت بھی نہ تھی کہ اسے اپنے اوپر سے دھکیل دے اسے ہر وقت موت سامنے کھڑی نظر آتی۔ شوہر اور بچہ کسی سے بھی اسے رغبت نہ تھی۔ سب ہی اپنے مطلب کے یار ہیں۔ برسات کے دنوں میں جب للو کو دست آنے لگے اور اس نے دودھ پینا چھوڑ دیا تو جھنیا کو اپنے سر سے ایک بلا کے ٹل جانے کا احساس ہوا۔ مگر جب ایک ہفتے کے بعد لڑکا مر گیا تو اس کی یاد مہر مادری سے زندہ ہو کر اسے رلانے لگی۔

جھنیا کو اب للو کی یاد للو سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ للو جب تک سامنے تھا تو وہ اس سے جتنا سکھ پاتی تھی اب اس سے کہیں زیادہ دکھ پاتی ہے۔

اب للو اس کے دل میں آبیٹھا تھا۔ مطمئن، ساکت، محبت سے معمور اور ہنستا ہوا! اس کے تصور میں اب ایک پرالمناک سرور تھا جس میں ظہور کا سیاہ سایہ نہ تھا باہر والا للو اس کے اندر والے للو کا محض عکس تھا۔ وہ عکس سامنے نہ تھا جو باطل اور ناپائیدار تھا۔ حقیقی مجسمہ تو اس کے اندر تھا جو اس کی تمناؤں اور خیر خیر اندیشیوں سے زندہ ہو رہا تھا۔ دودھ کی بجائے وہ اسے اپنا خون پلا پلا کر پال رہی تھی۔ اسے اب وہ بند کوٹھری اور وہ بدبودار ہوا اور وہ دونوں وقت آگ کے سامنے جلنا، ان باتوں کا گویا احساس ہی نہ رہ گیا تھا۔ وہ میٹھی یاد دلنشین ہو کر گویا اسے قوت دے رہی تھی۔ جیتے جی جو اس کی زندگی کا بار تھا وہ مر کر اس کی روح میں سما گیا تھا۔ اس کی ساری ممتا اندر کی طرف جا کر باہر کی جانب سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ گوبر دیر میں آتا ہے یا جلد، رغبت سے کھانا کھاتا ہے یا نہیں، خوش ہے یا رنجیدہ، ان باتوں کی اب اسے بالکل فکر نہ تھی۔ گوبر کیا کماتا ہے اور کیسے خرچ کرتا ہے، اس کی بھی اسے پروا نہ تھی۔ اس کی زندگی جو کچھ تھی اندر تھی، باہر تو صرف ایک بیجان مشین تھی!

اس کے غم میں شریک ہو کر، اس کی اندرونی زندگی میں داخل ہو کر گوبر اس کے پاس جا سکتا تھا اور اس کی زندگی کا جزو بن سکتا تھا۔ مگر وہ اس بیرونی زندگی کے خشک ساحل پر جا کر ہی پیاسا لوٹ آتا تھا!

ایک دن اس نے رکھائی سے کہا: "تو للو کے نام کو کب تک روئے جائے گی؟ چار پانچ مہینے تو ہو گئے۔"

جنیا نے سرد آہ بھر کر کہا: "تم میرا دکھ نہیں سمجھ سکتے۔ اپنا کام دیکھو میں جیسی ہوں ویسی ہی پڑی رہنے دو۔"

"ترے رونے رہنے سے للو لوٹ آوے گا؟"

جھنیا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اٹھ کر دیگچی میں کچالو کے لئے آلو اُبالنے لگی۔ اس نے گوبر کو ایسا سنگدل نہ سمجھا تھا۔

اس ہمدردی نے للّو کو اس کے دل میں اور بھی متحرک کر دیا۔ للّو اسی کا ہے، اس میں کسی کا ساجھا نہیں، کسی کا حصہ نہیں۔ ابھی تک للّو کچھ نہ کچھ اس کے دل کے باہر بھی تھا، گوبر کے دل میں بھی اس کا کچھ شائبہ تھا، مگر اب وہ پوری طور پر اسی کا تھا۔

گوبر نے خوانچے سے نزاس ہو کر شکرمل میں نوکری کر لی تھی۔ مسٹر کھنّا نے پہلے مل سے حوصلہ پا کر حال ہی میں یہ دوسرا مل کھول دیا تھا۔ گوبر کو وہاں بڑے سویرے جانا پڑتا اور دن بھر کے بعد جب وہ چراغ جلتے گھر واپس آتا تو اس کے بدن میں ذرا بھی جان نہ رہ جاتی۔ پہلے گھر پر بھی اسے کچھ کم محنت نہ کرنی پڑتی تھی، مگر وہاں اسے ذرا بھی تکان نہ ہوتا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ہنس بول بھی لیا کرتا تھا۔ پھر اس کھلے میدان میں، کھلے آسمان کے نیچے، گویا اس کی کمی بھی پوری ہو جاتی تھی۔ وہاں اس کا جسم چاہے جتنا کام کرے، دل آزاد رہتا تھا۔ آپ یہاں اتنی جسمانی محنت نہ ہونے پر بھی جیسے اس طوفانی شور اور ہل چل کا اس پر بوجھ سا لدا رہتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب ڈانٹ پڑ جائے۔ سب ہی مزدوروں کی یہی حالت تھی۔ سب ہی تاڑی یا شراب میں اپنی جسمانی اور دماغی تکان کو ڈبو دیا کرتے تھے۔ گوبر کو بھی شراب کا چسکا پڑا۔ گھر آتا تو نشہ میں چور اور بہرات گئے۔ اور اگر کوئی نہ کوئی بہانہ کھوج کر جھنیا کو گالیاں دیتا، گھر سے نکالنے لگتا۔ اور کبھی کبھی مار بھی دیتا۔

جھنیا کو اب یہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ داشتہ ہے۔ اسی لئے

اس کی یہ ذلت ہو رہی ہے۔ منکوحہ ہوتی تو گوبر کی مجال نہ تھی کہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا، برادری اسے سزا دیتی، حقہ پانی بند کرتی۔ اس نے کتنی بڑی غلطی کی کہ اس بے وفا کے ساتھ گھر سے نکل بھاگی۔ ساری دنیا میں ہنسی بھی ہوئی اور ہاتھ کچھ نہ آیا۔ وہ گوبر کو اپنا دشمن سمجھنے لگی۔ نہ اس کے کھانے پینے کی پروا کرتی اور نہ اپنے کھانے پینے کی۔ جب گوبر اسے مارتا تو اسے ایسا غصہ آتا کہ اس کا گلا چھرے سے کاٹ ڈالے۔ زچگی کا زمانہ جوں جوں قریب آتا جاتا ہے، اس کی تشویش بڑھتی جاتی ہے۔ اس گھر میں تو اس کا مرن ہو جائے گا۔ کون اس کی دیکھ بھال کرے گا؟ کون اسے سنبھالے گا؟ اور جو گوبر اسی طرح مارتا پیٹتا رہا تو اس کا جینا اور بھی کٹھن ہو گا۔

ایک روز وہ نل پر پانی بھرنے گئی تو پڑوس کی ایک عورت نے پوچھا: "کے مہینہ کا ہے رے؟"

جھنیا نے لجا کر کہا: "کیا جانے دیدی، میں نے تو گنا ہی نہیں۔"

دوہرے بدن کی، سیاہ فام پستہ قد، بدصورت عورت تھی۔ اس کا شوہر یکہ ہانکتا تھا اور وہ خود لکڑی کی دوکان کرتی تھی۔ جھنیا کئی بار اس کے یہاں سے لکڑی لائی تھی۔ اسی قدر تعارف تھا۔

مسکرا کر بولی: "مجھے تو جان پڑتا ہے کہ دن پورے ہو گئے ہیں۔ آج ہی کل میں ہو گا۔ کوئی دائی ٹھیک کر لی ہے؟"

جھنیا نے ڈری ہوئی آواز میں کہا: "میں تو یہاں کسی کو نہیں جانتی۔"

"تیرا مرد کیسا ہے جو کان میں تیل ڈالے بیٹھا ہے؟"

"انھیں میری کیا پھکر (فکر)؟"

"ہاں دیکھ تو رہی ہوں۔ تم تو سودر (زچہ خانے) میں بیٹھو گی، کوئی کرنے

دھرنے والا چاہیئے کہ نہیں ؟ ساس نند، دیورانی، جٹھانی کوئی ہے کہ نہیں؟ کسی کو بلا لینا تھا۔"

"میرے لئے سب مر گئے۔"

وہ پانی لا کر جوٹھے برتن ملنے لگی تو زچگی کے اندیشے سے دل دھڑکنے لگا۔ سوچنے لگی: "کیسے کیا ہوگا بھگوان ؟

اُنہ! یہی تو ہوگا کہ مر جاؤں گی، اچھا ہے، جنجال سے چھوٹ جاؤں گی"۔

شام کو اس کے پیٹ میں درد شروع ہوا، سمجھ گئی کہ بپتا کی گھڑی آپہنچی پیٹ کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے اور پسینے سے بھیگی ہوئی ہو۔ اس نے چولھا جلایا، کھچڑی ڈالی اور درد سے بیتاب ہو کر وہیں زمین پر پڑ رہی۔ کوئی دس بجے رات کو گوبر آیا، تاڑی کی بدبو اڑتا ہوا لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اوٹ پٹانگ بک رہا تھا۔ "مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ جسے سو بار گرج (غرض) ہو، رہے، نہیں چلا جائے۔ میں کسی کا تاؤ نہیں سہ سکتا۔ اپنے ماں باپ کا تاؤ نہیں سہا جن نے جنم دیا۔ تب دوسروں کا تاؤ کیوں سہوں جمعدار آنکھیں دکھاتا ہے تو یہاں کسی کی دھونس سہنے والے نہیں ہیں۔ لوگوں نے پکڑ نہ لیا ہوتا تو کھون (خون) پی جاتا کھون! کل دیکھوں گا بچہ کو۔ پھانسی ہی تو ہوگی۔ دکھا دوں گا کہ مرد لوگ کیسے مرتے ہیں، ہنستا ہوا اکڑتا ہوا اور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا پھانسی پر چڑھ جاؤں تو سہی۔ عورت کی جات کتنی مطلبی ہوتی ہے۔ کھچڑی ڈال دی اور پاؤں پسار کر سو رہی۔ کوئی کھائے چاہے نہ کھائے۔ اس کے ٹھینگے سے! آپ مجے (مزے) میں پھلکے اڑاتی ہے اور میرے لئے کھچڑی اچھا ستاتے بنے، تجھے بھگوان ستائیں گے۔"

اس نے جھنیا کو جگایا نہیں۔ کچھ بولا بھی نہیں، چپکے سے کھچڑی تھالی میں نکا اور دو چار لقمے نگل کر برآمدے میں لیٹ رہا۔ پچھلے پہر اسے سردی لگی۔ کوٹھر میں کمبل لینے گیا تو جھنیا کے کراہنے کی آواز سنی نشہ اتر چکا تھا۔

پوچھا "کیسا جی ہے جھنیا؟ کہیں درد ہے کیا؟"

"ہاں پیٹ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔"

"تو نے پہلے کیوں نہیں کہا؟ اب اس بکھت (وقت) کہاں جاؤں؟"

"کس سے کہتی؟"

"میں کیا مر گیا تھا؟"

"تمھیں میرے مرنے جینے کی کیا چنتا؟"

گوبر گھبرایا۔ کہاں دائی کھوجنے جائے؟ اس وقت وہ آنے ہی کیوں لگی۔ گھر میں کچھ ہے بھی تو نہیں، چڑیل نے پہلے تبلادیا ہوتا تو کسی سے دو چار روپئے مانگ لاتا۔ ان ہی ہاتھوں میں سو پچاس روپئے ہردم پڑے رہتے تھے چار آدمی کھسامد (خوشامد) کرتے تھے۔ اس کلمُنہی کے یہاں آتے ہی جیسے لچھمی روٹھ گئی ٹکے ٹکے کو محتاج ہو گیا۔

دفعتاً کسی نے پکارا "یہ کیا تمھاری گھر والی کراہ رہی ہے؟ درد تو نہیں ہو رہا ہے؟"

یہ وہی موٹی کالی عورت تھی جس سے آج جھنیا کی بات چیت ہوئی تھی۔ گھوڑے کو دانہ کھلانے اٹھی تھی اور جھنیا کا کراہنا سن کر پوچھنے آ گئی تھی۔

گوبر نے برآمدے میں جا کر کہا "پیٹ میں درد ہے چھٹ پٹا رہی ہے۔ یہاں کوئی دائی ملے گی؟"

"وہ تو میں آج اسے دیکھ گئی تھی۔ دائی کچی سرائے میں رہتی ہے۔ لپک کر

لاؤ۔ تب تک میں یہیں بیٹھی ہوں۔"

میں نے کچی سرائے نہیں دیکھی، کدھر ہے؟"

"اچھا تم اسے پنکھا جھلتے رہو، میں بلائے لاتی ہوں۔ یہی کہتے ہیں کہ اناڑی آدمی کسی کام کا نہیں۔ پورا پیٹ اور دانی کی کھوج نہیں۔"

یہ کہتی ہوئی وہ چل دی۔ اس کے منہ پر تو لوگ اسے چوہیا کہتے تھے لیکن غیبت میں مٹلی کہا کرتے تھے۔ کسی کو مٹلی کہتے سن لیتی تھی تو اس کے سات پرکھوں تک چڑھ جاتی تھی۔

گوبر کو بیٹھے دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ وہ لوٹ آئی اور بولی "اب سنسار میں گریبوں کا کیسے نباہ ہوگا۔ رانڈ کہتی ہے کہ پانچ روپئے لوں گی، تب چلوں گی، اور آٹھ آنے روج (روز) اور بارہویں دن ایک ساڑی میں نے کہا تیرا منہ جھلس دوں! تو جا چولھے میں! میں دیکھ لوں گی، بارہ بچوں کی ماں یونہی نہیں ہوگئی ہوں۔ تم باہر آجاؤ گوبر دھن، میں سب کروں گی۔ بکھت پڑے پر آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ چار بچے جنا لئے تو دائی بن بیٹھی۔"

وہ جھنیا کے پاس جا بیٹھی اور اس کا سر اپنی جانگھ پر رکھ کر اس کا پیٹ سہلاتی ہوئی بولی "میں تو آج تجھے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔ سچ پوچھو تو آج اسی دھڑکے میں مجھے نیند نہیں آئی۔ یہاں تیرا کون سگا بیٹھا ہے؟"

جھنیا نے درد سے دانت جما کر سی، کرتے ہوئے کہا: اب نہ بچونگی دیدی! میں تو بھگوان سے مانگنے نہ گئی تھی۔ ایک کو پالا پوسا، اسے تم نے چھین لیا تو پھر اس کا کون کام تھا؟ میں مرجاؤں ماتا، تو اس بچے پر دیا کرنا، اسے پال پوس لینا۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں گے۔"

چوہیا محبت سے اس کے بال سلجھاتی ہوئی بولی "دھیرج دھر بیٹی،

دھیرج دھر! ابھی چھن بھر میں کشٹ (تکلیف) کٹا جاتا ہے۔ تو نے بھی تو جیسے چپّی ساد ھ لی ہے۔ اس میں کس بات کی لاج؟ مجھ سے بتا دیا ہوتا تو میں مولوی صاحب کے پاس سے گنڈا لا دیتی، وہی مرجا امرزا جی جو اس احاطے میں رہتے ہیں۔"

اس کے بعد جھنیا کو کچھ ہوش نہ رہا۔ نو بجے صبح اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ چوہیا بچّے کو لئے بیٹھی اور وہ صاف ساڑی پہنے ہوئے لیٹی ہے۔ ایسی کمزور تھی گویا بدن میں خون کا نام نہ ہو۔

چوہیا روزانہ صبح آکر جھنیا کے لئے حریرہ اور حلوا پکا جاتی اور دن میں بھی کئی بار آکر بچے کو ابٹن ملتی اور اوپر کا دودھ پلا جاتی۔ آج چوتھا دن تھا مگر جھنیا کے دودھ نہ اترا تھا۔ بچّہ رو رو کر گلا پھاڑے لیتا تھا کیونکہ اوپر کا دودھ اسے ہضم نہ ہوتا تھا۔ ایک لمحہ بھی چپ نہ رہتا۔ چوہیا اپنا دودھ اس کے منہ میں دیتی۔ بچّہ ایک منٹ چوستا مگر جب دودھ نہ نکلتا تو چیخنے لگتا۔ جب چوتھی شام تک بھی جھنیا کے دودھ نہ اترا تو چوہیا گھبرائی۔ بچّہ سوکھتا چلا جاتا تھا۔ نخاس پر ایک پنشنر ڈاکٹر رہتے تھے وہ انھیں لے آئی ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا:" اس کے بدن میں خون تو ہے نہیں، پھر دودھ کہاں سے آئے؟ معاملہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بدن میں خون لانے کے لئے مہینوں مقوی دوائیں کھانی پڑیں گی تب کہیں دودھ اترے گا۔ اس وقت تک تو اس گوشت کے لوتھڑے کا کام ہی تمام ہو جائے گا۔"

پھر رات ہو گئی تھی۔ گوبر تاڑی پیئے ہوئے دالان میں پڑا تھا۔ چوہیا بچّے کو چپ کرانے کے لئے اس کے منہ میں اپنا دودھ ڈالے ہوئے تھی۔ یکایک اسے معلوم ہوا کہ اس کے خود دودھ اتر آیا ہے۔ خوش ہو کر بولی۔

"لے جھنیا اب تیرا بچّہ جی جائے گا، میرے دودھ آگیا۔"

جھنیا نے تعجب سے کہا: "تمھارے دودھ آگیا؟"

"نہیں ری، سچ!"

"میں تو نہیں بسواس کرتی۔"

"دیکھ لے۔"

اس نے اپنا دودھ دبا کر دکھایا۔ دھار پھوٹ نکلی۔

جھنیا نے پوچھا: "تمھاری چھوٹی لڑکی تو آٹھ سال سے کم نہیں ہے؟"

"ہاں آٹھواں برس ہے، پر میرے دودھ بہت ہوتا تھا۔"

"ادھر تو تمھیں کوئی بال بچہ نہیں ہوا؟"

وہی لڑکی پیٹ پونچھنی (آخری) تھی۔ چھاتی بالکل سوکھ گئی تھی۔ مگر بھگوان کی لیلا ہے اور کیا۔"

اب سے چوہیا چار پانچ بار آکر بچے کو دودھ پلا جاتی۔ بچہ پیدا تو ہوا تھا کمزور، مگر چوہیا کا صحت بخش دودھ پی کر موٹا ہوتا جاتا تھا۔ ایک روز چوہیا ندی نہانے چلی گئی۔ بچہ بھوک سے چھٹ پٹانے لگا۔ چوہیا دس بجے لوٹی تو جھنیا بچے کو کندھے سے لگائے جھلا رہی تھی اور وہ روئے جاتا تھا۔ چوہیا نے بچے کو اس کی گود سے لے کر دودھ پلا دینا چاہا مگر جھنیا نے اسے جھڑک کر کہا: "رہنے دو۔ ابھاگا مر جائے یہی اچھا کسی کا احسان تو نہ لینا پڑے۔"

چوہیا گڑگڑانے لگی۔ جھنیا نے بڑے مناؤں کے بعد بچے کو اس کی گود میں دیا۔

لیکن جھنیا اور گوبر میں اب بھی نہ بنتی تھی۔ جھنیا کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ یہ پکا مطلبی اور بیدرد آدمی ہے، مجھے صرف اپنے شوق و آرام کی چیز

سمجھتا ہے چاہے میں مروں یا جیوں۔ اس کی اچھا پوری ہوتی جائے، اسے بالکل رنج نہیں۔ سوچتا ہوگا کہ یہ مرجائے گی تو دوسری لاؤں گا۔ مگر منہ دھو رکھیں سچا میں ہی ایسی الھڑ تھی کہ تمھارے پھندے میں آگئی تب تو پاؤں پڑتا رہتا تھا اب یہاں آتے ہی نہ جانے کیوں جیسے اس کا بھاؤ ہی بگڑ گیا۔ جاڑا آگیا تھا۔ مگر نہ اوڑھنے کو تھا نہ بچھانے کو۔ روٹی دال سے جو دو چار روپے بچتے وہ تاڑی میں اڑ جاتے تھے۔ ایک پرانا لحاف تھا دونوں اسی میں سوتے تھے پھر بھی ان میں سو کوس کا فاصلہ تھا۔ دونوں ایک ہی کروٹ میں رات کاٹ دیتے تھے۔

گوبر کا جی بچے کو گود میں لے کر کھلانے کے لئے ترس کر رہ جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات کو اٹھ کر اس کا پیارا مکھڑا دیکھ لیا کرتا، مگر جھنیا کی جانب سے اس کے دل میں کشیدگی تھی۔ جھنیا بھی اس سے بات نہ کرتی، نہ اس کی کچھ خدمت ہی کرتی۔ دونوں کے درمیان میں یہ کدورت، وقت کے ساتھ لوہے میں زنگ کی طرح گہری، مضبوط اور سخت ہوتی جاتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی باتوں کا الٹا ہی مطلب نکالتے، وہی جس سے باہمی منافرت میں زیادتی ہو اور کئی دن تک ایک ایک بات کو دل میں رکھے رہتے، گویا شکاری کتے ہوں۔

ادھر گوبر کے کارخانے میں بھی آئے دن ایک نہ ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ اب کے بجٹ میں شکر پر ٹیکس لگ گیا تھا۔ مل کے مالکوں کو اجرت گھٹانے کا اچھا بہانہ مل گیا۔ ٹیکس سے اگر پانچ کا نقصان تھا تو اجرت گھٹا دینے سے دس کا منافع تھا۔ ادھر مہینوں سے اس مل میں بھی یہی مسئلہ چھڑا ہوا تھا۔ مزدور جماعت ہڑتال کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔ ادھر مزدوری گھٹی